chapter 2

باب دوم

ادبی اور فکری پس منظر

بیسویں صدی سماجی و سیاسی اور فکری و تہذیبی اقدار کے شکست و ریخت کی صدی رہی ہے۔ ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے تسلط کے بعد نہ صرف سیاسی اور اقتصادی سطح پر ہی ہندوستانی معاشرہ تغیر و تبدل سے دوچار ہوا بلکہ عدالتی نظم و نسق بھی بدلا اور افکار و خیالات، اقدارِ حیات، عقائد اور تہذیبی و نظریاتی سطح پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

مغربی افکار و خیالات کے پیشِ نظر عقلیت پسندی کو فروغ ہوا۔ سوچنے سمجھنے کا انداز بدلا، ادبی موضوعات بدلے اور غور و فکر کے انداز میں بھی تبدیلی آئی۔ غزل کی جگہ نظم کو رواج دینے کا رجحان پیدا ہوا اور نیچرل شاعری کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کی شکل میں ہوئی اور فرسودہ اقدارِ تہذیب و معاشرت کی اصلاح اس کا مقصد قرار پایا۔ یہ ادب کا اصلاحی اور اجتہادی دور تھا کیوں کہ ان شاعروں کی بدولت ہی اردو شاعری جدید افکار و خیالات اور نظریات و موضوعات کے وسیع تر سرمائے سے مالا مال ہوئی اور حب الوطنی کے تصور کے ماتحت اقوامِ ہند کو یکجہتی، انسان دوستی، ہمدردی اور محبت و مروت کا درس دیا گیا نیز ان کی بے حسی، تنگ نظری اور جہالت کا احساس دلایا گیا۔ ان نظریات و خیالات کی نشاندہی خواجہ الطاف حسین حالی کی نشاطِ امید مناظرۂ رحم و انصاف اور حبِ وطن اور مولانا محمد حسین آزاد کی خوابِ امن

صبحِ امید اور حبِ وطن ایسی نظموں میں کی جا سکتی ہے۔ ان نظموں کو جدید شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دینا غلط نہ ہوگا کیوں کہ انہی سے اردو شاعری میں وطنیت اور قومی یکجہتی کے رجحان کو فروغ ملا اور اسی زمانے میں اردو شاعری میں نئے سمتوں کا تعین بھی ہوا اور نازک خیالی کی جگہ حقیقت نگاری اور اثر آفرینی پر زور دیا گیا۔ لہذا کہہ سکتے ہیں کہ محمد حسین آزاد اور خواجہ حالی نے معاشرتی اصلاح، مناظرِ فطرت کی عکاسی، حب الوطنی کے تصور اور قومی یکجہتی کے جذبہ و احساس کے ساتھ نظم کی صنف کو فروغ دیا جس نے آگے چل کر ہندستان کی سیاسی آزادی، قومی وطنی خیالات، جمہور کے جذبات، کسانوں اور عورتوں کے مختلف النوع مسائل کے اظہار کا تخلیقی سانچہ قرار پایا۔

یہاں سرسید تحریک کا ذکر بے محل نہ ہوگا کیوں کہ ادبی و فکری نقطۂ نظر سے اس تحریک کا اثر اردو ادب پر بہت گہرا ہے اور یہ تحریک معاشرتی و تہذیبی اصلاح کے ساتھ ساتھ ادبی اصلاح کی تحریک کی حیثیت سے بھی نمایاں ہوئی تھی جس کا براہِ راست یا بالواسطہ اثر خواجہ حالی اور محمد حسین آزاد پر بھی ہوا۔ حالی تو سرسید تحریک کے رکنِ خاص تھے اور مولانا محمد حسین آزاد کا براہِ راست تعلق اگرچہ سرسید کی اس تحریک سے نہیں تھا لیکن ان کے یہاں جو جدید ادبی و فکری رجحان ملتا ہے اسے کم و بیش اس تحریک کا اثر قرار دے سکتے ہیں۔

سرسید اور ان کے رفقائے کار (خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، محسن الملک، ڈاکٹر مولوی نذیر احمد وغیرہ) نے نئی تعلیم اور جدید فکر کے زیرِ اثر عقلیت پر زور دیا اور شعر و ادب کو زندگی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ اس تحریک کی تشکیل جن سماجی عوامل نے کی تھی اور یہ تحریک جس سماجی گروہ یا طبقہ کی آرزوؤں اور تمناؤں کی علم بردار تھی انھوں نے اسے مغرب کی مادہ پرستی کی طرف بھی راغب کیا اور مغربی علوم، ادب اور فن اور خیالات و افکار کی طرف بھی مائل کیا۔

سرسید تحریک کا نصب العین مسلم متوسط طبقہ کی زوال پذیر اور شکستہ معاشرتی اور معاشی صورت حال کی از سر نو بہتر تشکیل کرنا تھا لیکن جاگیردارانہ عہد کی فرسودہ روایات، تہذیبی اقدار اور توہم پرستی راہ میں حائل تھیں۔ اسی سبب سے سرسید اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانوں کو جہالت، توہمات، فرسودہ رسم و رواج اور تعیش پسندی کے رویہ سے نجات دلانے کا بیڑہ اٹھایا اور غیرتِ قومی و عظمتِ انسانی کا احساس دلایا۔

اس اصلاحی تحریک کی بدولت ان لوگوں نے اپنے مقاصد کی ترسیل و تبلیغ کے لیے جدید اسلوب، اصنافِ ادب اور تکنیک کی تلاش کی۔ گویا موضوعات بدلے تو ہیئتی سانچوں میں بھی تبدیلی آگئی۔ خیالی داستانوں کا دور ختم ہوا اور اصلاحی ناول منظرِ عام پر آئے۔ نذیر احمد نے عورتوں کی تعلیم، عقدِ بیوگان اور فرسودہ اقدار کی پاسداری جیسے سماجی مسائل کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے صنفِ ناول کا انتخاب کیا اور اردو ادب میں اس صنف کی داغ بیل ڈالی۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی حالی کی مسدس مد و جزرِ اسلام ہے۔ اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔ دوسری طرف روایتی شاعری سے الگ جدید شعری اظہار کی طرف بھی حالی اور آزاد متوجہ ہوئے۔ حالی نے شعری ادب کے لیے نئے اصول و ضوابط وضع کیے اور آزاد نے نظم کی صنف کو شاعرانہ اظہار کے لیے موثر اور مفید قرار دیا۔ اس دور کے ادب میں اصلاحِ معاشرہ کی عملی کوششیں بھی تھیں اور مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی، ہندوستانی تہذیب کی اعلا اقدار کے تعمیر و تحفظ کا احساس بھی تھا اور سماجی و سیاسی شعور اور فکری بصیرت بھی۔ اور انجمن پنجاب کے شاعروں کا مقصد بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ اردو شاعری کے ذریعہ مجروح اقدارِ تہذیب کی اصلاح اور ذہن و شعور کی تشکیل ہو اور قومی و وطنی جذبہ پیدا ہو۔

حالی اور آزاد کی اس شعری روایت نے آگے چل کر باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں ہندستان کی عظمت اور قومی و وطنی جذبات و خیالات کو جن شعراء نے اپنا موضوعِ سخن قرار دیا ان میں علامہ اقبال، چکبست لکھنوی، اکبر الہ آبادی، علامہ شبلی نعمانی، سرور جہاں آبادی، اسماعیل میرٹھی اور جوش ملیح آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ پریم چند نے ہندستان کی سب سے بڑی آبادی یعنی کسانوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ عورتوں کے مسائل کو بھی اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ انھوں نے اردو فکشن میں انتقادی حقیقت نگاری کی سنجیدہ، مربوط اور دلکش روایت کا آغاز کیا۔

اکبر الہ آبادی نے مغربی تعلیم کی اہمیت تسلیم نہیں کی لیکن قومی درد کی تصویر ان کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ شبلی نعمانی کے یہاں مسلم لیگ مخالف خیال اور کانگریس کی حمایت کا جذبہ ملتا ہے۔ سرور جہاں آبادی نے قومی نوحہ، شمعِ انجمن لکھی البتہ چکبست لکھنوی نے نہ صرف بیسویں صدی کی ابتدائی قومی اور سیاسی تحریکوں کے زیرِ اثر اردو شاعری میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا ہے بلکہ ہوم رول تحریک کے ہنگامی جوش و خروش کو اپنے اشعار کے ذریعہ زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم، ہوم رول کے بدلے

کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔

اقبال نے نظم کے کینوس کو زیادہ وسیع کیا اور فکر و فلسفہ، سیاسی، معاشی اور معاشرتی موضوعات نئی علامتوں، استعاروں اور ترکیبوں کے ساتھ پیش کیے۔ جوش ملیح آبادی نے انقلابی آہنگ اور خطیبانہ اندازِ بیان اختیار کیا اور اسماعیل میرٹھی نے بچوں کی نظموں کے علاوہ

انگریزی نظموں کے ترجمے کے ذریعہ اصلاحِ معاشرہ کے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان دہائیوں میں اگرچہ بہت حد تک پرانے ادب سے انحراف کیا گیا۔ روایتی موضوعات سے، جن کی بنیاد عام طور سے روحانیت یا پھر تصوریت پر تھی، گریز کیا گیا۔ معروضی حقیقتوں کی طرف میلان ہوا اور ادب میں خارجی حقیقتوں کو پیش کرنے پر زور دیا گیا لیکن ہیئتی سطح پر کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی البتہ موضوعات کے ساتھ اسالیب ضرور تبدیل ہوئے جو مروجہ ہیئتی سانچوں میں ڈھلے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

> اس عہد میں موضوعات کے تنوع اور وسعت کے باوجود جو باتیں بالکل نمایاں ہو کر متوجہ کرتی ہیں وہ قومی اور سیاسی، وطنی اور ملکی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان کا ذکر نئے شعور اور نئے جذباتی پس منظر کے ساتھ آتا ہے۔ قوم اور وطن کا ذکر اخلاقی نہیں سیاسی اور فکری پہلو اختیار کرلیتا ہے۔ ؎۱

اسی زمانے میں رومانوی رجحان بھی فروغ پاتا ہے۔ یہ تحریک یورپ کی رومانوی تحریک سے کسی حد تک متاثر ضرور تھی لیکن اس کا کوئی باضابطہ نصب العین نہیں تھا اور نہ کوئی مخصوص فکر اور نظریۂ حیات۔ اردو میں رومانیت کے زیرِ اثر عقل سے زیادہ جذبے اور وجدان کو اہمیت حاصل رہی۔ انفرادیت پرستی اور فرد کی اہمیت کو اہم قرار دیا گیا اور حسن و شباب کو خلاصۂ کائنات سمجھا گیا اور اس کی بنیاد خالص

؎۱ جدید ادب: منظر اور پس منظر ص ۱۹۵

تصوریت اور ماورائیت پر رکھی گئی، اسی لیے پروفیسر محمد حسن نے اسے جذبے کے وفور سے تعبیر کیا ہے[۵۲]۔ کیوں کہ جذبہ و احساس کا یہ میلان تصوریت اور ماورائیت کی طرف مراجعت کرتا ہے اور خواب وخیال کی دنیا تک پہنچتا ہے جس کے ڈانڈے دل شکستگی، حرماں نصیبی، انفعالیت اور کرب و اضطراب کی کیفیت سے جا ملتے ہیں اور پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں:

> رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنالیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کہیں خود موت کی آرزو کرتا ہے، کہیں جواں مرگی کو مبارک بتاتا ہے وہ اپنی محبوبائیں کو یا تو کسی دیوقامت اساطیری جن کے آہنی قلعوں میں مقید اور منتظر تصور کرتا ہے یا فراق کے گیت گاتے ہوئے دیکھتا ہے۔[۵۳]

پروفیسر محمد حسن نے یہ بات یورپ کے رومانوی رجحان کے پس منظر میں کہی ہے جہاں فطرت کی طرف واپسی، رومانوی افسردگی، ابتدائیت، جذباتیت، انفرادیت، انسان پرستی اور مثالیت پسندی، رومانوی طرزِ ادا، رومانوی تخیل اور رومانوی انقلاب کو خصوصی

۵۲ اردو میں رومانوی تحریک ص ۲۰

۵۳ ایضاً ایضاً ص ۱۷

اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اردو کے رومانوی شاعروں کے یہاں فطرت سے لگاؤ اور دلچسپی کا رجحان ضرور ہے مگر فطرت کی طرف واپسی کا فلسفہ جو یورپی رومانوی تحریک کا خاصہ رہا ہے، ناپید ہے۔ اردو شاعری میں یہ رجحانات کم وبیش علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کے یہاں ملتے ہیں۔

اقبال کے یہاں جذبات اور وجدان کو اہمیت حاصل ہے اور نظریۂ عشق و خرد مثالیت پسندی کا مظہر۔ شاہین اور مرد مومن کا تصور، عشق کے اسی تصور سے وابستہ ہے پھر فطرت سے لگاؤ اور دلچسپی کا رجحان بھی رومانیت کے اسی تصور کا احساس دلاتا ہے۔ جوش نے اگرچہ عقل پر زور دیا ہے مگر ان کے یہاں جذباتیت کا غلبہ ہے تاہم بدلی کا چاند، البیلی صبح اور کسان جیسی نظموں میں فطرت سے وابستگی کی طرف میلان کا احساس ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کے تصور میں رومانیت کی تلاش کی جاسکتی ہے لیکن اب عورت پہلی بار اپنے نسائی بانکپن اور نسوانی پیکر کے ساتھ اردو شاعری میں جلوہ گر ہوئی۔ ساحر لدھیانوی نے شاید اسی لیے کہا تھا کہ اختر شیرانی بڑا گریٹ شاعر ہے، اس نے اردو شاعری کو عورت بخشی ہے۴ کیوں کہ "جگر اور جوش تک محبوب کو مذکر باندھتے تھے مگر اختر شیرانی نے اردو شاعری میں سلمیٰ سے براہِ راست خطاب کر کے تکلفات، حجابات اور مصلحت کی تمام دیواریں گرادیں اور اس طرح اردو شاعری میں محبوبہ اپنی اصلی صورت میں داخل ہوئی یہی اختر شیرانی کا کمال تھا۔"۵ اور تمام تر نہیں تو بیشتر ترقی پسند شعراء

۴۔ بحوالہ ساحر لدھیانوی۔ میرا دوست: قمر اجنالوی، فن اور شخصیت بمبئی ساحر لدھیانوی نمبر ص ۲۱

۵۔ ساحر لدھیانوی۔ میرا دوست: قمر اجنالوی ایضاً ایضاً ص ۱۲۱

کے یہاں رومانیت کا یہ احساس نمایاں ہے۔ بہرحال جذبے اور خیال کی فراوانی نے اظہار کے بندھے ٹکے اصولوں کو بھی توڑ دیا لہذا روایتی ہیئتی سانچے یا تو ٹوٹے یا ان میں تراش خراش اور کتر بیونت کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح ایک طرف اردو شاعری میں گیت اور سانیٹ کی صنف نے رواج پایا اور دوسری طرف پرانے اسالیب میں نئے مفاہیم پیش ہوئے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں فرائڈ اور مارکس کے نظریے کو بہت اہمیت حاصل ہوئی جو بالترتیب جدیدیت اور ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ جدیدیت سے وابستہ شعراء چوں کہ شعوری اور فکری آزادی کے حامی اور ادب میں کسی قسم کی نظریاتی تقسیم کے خلاف تھے اس لیے انھوں نے کسی مخصوص نظریہ کی تلقین اور کسی مخصوص منشور کی تبلیغ کی پابندی کو ذہنی غلامی تصور کیا ان کا خیال تھا کہ انسانی شخصیت کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب روح اور جسم میں مکمل ہم آہنگی ہو اس طرح جدیدیت کے حامیوں نے بہ ظاہر ترقی پسند شعراء کے اجتماعی شعور کی نفی کر دی اور عصری نفسیاتی پیچیدگی، انفرادی زندگی کی محرومی و مایوسی اور جنسی فاقہ کشی کی توجیہات پر غور کیا ان شعراء کے شعری رویوں میں رد و قبول کا عنصر فرائڈ کے نظریۂ لاشعور اور تحلیل نفسی کا مظہر ہے۔ اس طرح جذباتیت کے غلبے، جنسی گھٹن، تحلیل نفسی، ماحول سے شدید بیزاری کے احساس اور ماضی کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے ان شعراء میں تشکیک، فرار، بیگانگی اور شکست خوردگی کو جنم دیا جو شدید ترین سیاسی اور سماجی کرب و اضطراب، گھٹن اور کشمکش سے پیدا ہوئی۔ پروفیسر احتشام حسین ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

فرائڈ سے اثر قبول کرنے والوں کے یہاں انفرادیت، ہیئتی تجربے، ابہام، زندگی سے بے تعلقی، عام سماجی تصورات سے گریز، بے یقینی اور مایوسی کی پرچھائیاں ملیں گی۔ ۵۶

آگے چل کر تھوڑے تفصیل سے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فرائڈ کے جنسی نظریات کے تحت محبت کا تصور بھی نیا روپ دھارنے لگا تھا۔۔۔۔ جنسی محبت کے فطری تقاضے اور لطیف حقیقی پیکر، قدیم اور جدید شعری ادب، مصوری اور صنم گری، رقص اور نقاشی میں بکھرے ہوئے ہیں، اگرچہ اخلاقی پابندیاں اس جذبے کو دباتی رہی ہیں لیکن یہ استعاروں اور علامتوں کے پردوں میں ہر جگہ عریاں ہوتا رہا ہے فرائڈ نے اس لاشعوری اور نیم شعوری تجسس کا پتا لگا کر ایک طرح سے شعور کو اس اظہار کے لیے آزاد کر دیا اور جنس کا ذکر اتنا ہی فطری نظر آنے لگا جتنا روٹی کپڑے اور مسرت و یاس کا ذکر۔ چنانچہ وہ شعراء جنھوں نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے لکھنا شروع کیا اور جنھیں مغرب کی ادبی تحریکوں سے واقفیت بھی تھی، انھوں نے محبت کے جنسی پہلو کا اظہار کھلے بندوں شروع کر دیا۔ اس میں جنسی کج روی،

۵۶ جدید ادب منظر اور پس منظر ص ۱۹۸۔ ۱۹۹

جنسی گھٹن اور تھکن ہر ایک کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں ..... جو شعرا ہئیت کے تجربوں میں لگے ہوئے تھے انھوں نے محبوب اور محبت کو نظر انداز کر دیا اور جو خالص جنسی ابال اور فطری میلان کی شکل میں دیکھتے تھے انھوں نے اس کے سراپا سے آنکھیں پھیر لیں کوئی شخص اس زمانے کے ن۔م۔ راشد، میراجی، مختار صدیقی کا کلام دیکھے تو وہ اپنے ذہن میں محبوب کی کوئی ایسی تصویر نہیں بنا سکتا جس کے لیے دل و جاں نذر کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ ۵۷

ان بیانات کی روشنی میں یہ بات تو کہی جا سکتی ہے کہ جدیدیت سے وابستہ شعرا کے یہاں انفرادی خواہشات اور تلاش ذات کا واضح تصور نمایاں ہوا ہے اور انفرادی آلام و مصائب اور ذاتی زندگی کے پیچیدہ تر مسائل ان کے یہاں شدید جھنجلاہٹ کی صورت جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن صنعتی دور کے اجتماعی انسان کا کرب و اضطراب بھی دبے پاؤں چلا آیا ہے جس کی نشاندہی میراجی کی نظم کلرک کا نغمۂ محبت میں کی جا سکتی ہے ایک مفلوک الحال منشی کی داستان حیات اس کا مرکزی خیال ہے جو سماجی مشین کے ایک بے نام پرزے میں تبدیل ہونے والے آدمی کی صورت ابھرتا ہے اور یہ آدمی جیسا کہ عبادت بریلوی کا خیال ہے محض اپنی ذات ہی میں گم نہیں ہے بلکہ اسے عصری زندگی کی حقیقتوں کا احساس بھی ہے اور سرمایہ و محنت کے تضاد کی خبر بھی ہے

لیکن میں تو اک منشی ہوں، تو اونچے گھر کی رانی ہے ہو

۵۷ جدید ادب: منظر اور پس منظر ص ۲۳۶-۲۳۷

کا یہ احساس اور شہری زندگی کی گہما گہمی کا یہ مشاہدہ بجائے خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ صنعتی زندگی کے پیدا شدہ مسائل پر میراجی کی نظر ٹھہری ہے۔ بایں ہمہ اسے کلیہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کیوں کہ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا کہ طبقاتی کشمکش اور انسانی کرب و اضطراب کا یہ احساس میراجی کے یہاں دبے پاؤں چلا آیا ہے گو ن۔م راشد کے الفاظ میں کسی نظریے یا مقصد کی تلقین کرنا نہیں ہے لیکن نہ میراجی اس سے بچ پائے نہ ن۔م۔ راشد اور نہ دوسرے فرائڈ سے متاثر اور جدیدیت کے علمبردار شعراء، چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ "اجتماعی زندگی بہرحال انفرادی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ انسانوں کے سماج میں یعنی اس دنیا میں جہاں ایک انسان اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے، مجرد انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"[۵۸] اور "ادیب لاکھ غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرے۔ اس کے کردار، اس کا موضوع، اس کے خیالات کسی نہ کسی قسم کی جانبداری کا پتہ ضرور دیتے ہیں۔"[۵۹] اور میراجی کے یہاں عصری حقیقتوں کا یہ احساس نہ صرف ن۔م۔ راشد اور خود میراجی کے خیالات و نظریات کی نفی کرتا ہے بلکہ ترقی پسند تحریک کے مثبت رویوں کو تقویت بھی پہنچاتا ہے۔

اس دور میں اگرچہ اردو شاعری میں مبہم انداز بیان عام ہوا اور دور از کار موضوعات، تشبیہات و استعارات اور بھونڈی تمثیلوں کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنا کر انھیں رواج دیا گیا بلکہ ہیئتی تجربے بھی کیے گئے اور آزاد اور معریٰ نظموں کو فروغ ملا۔

ترقی پسند تحریک کے حامیوں نے مارکس کے فلسفہ کو اپنایا اور

۵۸ افادی ادب: اختر انصاری بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۷۲

۵۹ ذوق ادب اور شعور: سید احتشام حسین ص ۱۱۱

اشتراکی خیال کو فروغ دیا جو کسی نہ کسی شکل میں اجتماعی و مجلسی زندگی کے آشوب و ابتلا سے وابستہ تھا۔ ان شاعروں نے شعور کو رہنما بنایا اور ادب اور زندگی کے معاشی و معاشرتی تعلق کا ادراک عقل کی روشنی میں کیا اور ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک کے موقف کا اظہار پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں کیا ہے:

مارکسزم کو مشعل راہ بنانے والوں کے یہاں عام طور سے حقیقت نگاری، خارجی اثرات کو قبول کرنا، سادگی اور صفائی، تجربے کے لیے تجربے سے گریز، مقصدیت، یقین، امید، سماجی احساس، آزادی اور انسان دوستی کی خواہش وغیرہ کا عکس ملے گا۔[۱۰]

اس کے ابتدائی نقوش اگرچہ جوش ملیح آبادی اور حسرت موہانی کے یہاں نظر آتے ہیں لیکن علامہ اقبال کی نظم خضر راہ کو اس کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ بقول خلیل الرحمن اعظمی:

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے پہلی بار اقبال کی شاعری میں سرمایہ دارانہ نظام اور محنت کش طبقے کی کش مکش کے موضوع کو نمایاں کیا جس کا نقش اولیں اقبال کی نظم خضر راہ ہے۔ اس نظم میں کانگریس کے اعتدال پسند رہنماؤں کے

۱۰۔ جدید ادب: منظر اور پس منظر ص ۱۹۸

برخلاف انقلابی نقطۂ نظر پیش کیا گیا اور ....
سرمایہ دارانہ نظام کی حیلہ گری کو بے نقاب کیا گیا
اور مزدور طبقے کو متحد و منظم ہونے کا پیغام دیا گیا۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے [۱۱]

مارکسی نظریے کے زیر اثر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ہوا لیکن ۱۹۳۲ء میں ہی سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کی کہانیوں کا مجموعہ انگارے کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اس کی اشاعت سے پرانی اقدارِ حیات اور فرسودہ سماجی و سیاسی حالات و ماحول کے خلاف باغیانہ رجحان پیدا ہوا اور ادب میں باضابطہ طور پر انتقادی اور اشتراکی حقیقت نگاری منعکس ہوئی۔

اس تحریک سے وابستہ بیشتر فنکار رومان سے حقیقت کی طرف آئے ہیں اس لیے ان کے یہاں رومانیت کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ جس میں حسن و عشق کے حادثات کی گرمی اور لطیف و نازک خواہشات کی نرمی کے ساتھ ساتھ فطرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے کا احساس نمایاں ہے۔ کرشن چندر کے یہاں طلسم خیال اور نظارے کے بعض افسانوں میں، فیض کے یہاں سرودِ شبانہ، تمھارے حسن کے نام، انتظار اور ایسی ہی دوسری نظموں میں، مجاز کے یہاں طلوعِ سحر، فردوس کی برنائی اور پیکرِ رعنائی کے احساس کے علاوہ نذرِ دل، طفلی کے خواب، نورا وغیرہ نظموں میں، جاں نثار اختر کی نظم گرلز کالج کی لاری اور مجروح سلطانپوری کی غزلوں

[۱۱] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۶-۲۷

میں سوال پیر لجانے اور زلف کے چہرہ پر اڑنے کا خیال ، مخدوم محی الدین کی نظموں انتظار اور پشیمانی میں اور کیفی اعظمی کی اندیشہ اور پشیمانی میں رومانیت کا احساس جاری و ساری ہے۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری کا آغاز اگرچہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ دور اول کے شعراء مثلاً فیض، مجاز، علی سردار جعفری وغیرہ کے بعد ہوا کیوں کہ ۱۹۳۷ء میں ہی مجاز کا مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا تھا اور فیض کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت اردو شاعری میں نئے شعور کی گونج بن کر ابھری تھی اور اس زمانے میں ساحر لدھیانوی میٹرک کے طالب علم تھے تاہم ان کی شاعری میں بھی رومانوی نظموں اور غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے مثلاً ردعمل، ایک منظر، انتظار، تیری آواز، کسی کو اداس دیکھ کر، یکسوئی اور خوبصورت موڑ اسی رومانیت کی غماز ہیں۔ جن میں جمالیاتی حسن بھی ہے اور عشق کا انوکھا احساس بھی۔ لیکن ان شعراء و ادباء کی رومانیت سطحی جذباتیت، تصوریت اور ماورائیت سے زیادہ حقیقت سے وابستہ اور سماجی و اجتماعی شعور کی حامل ہے۔ اس عہد کے شعراء نے غالب کے خیال کے برعکس مے کو نشاط کا وسیلہ تو بنایا لیکن بے خودی کا ذریعہ نہیں بننے دیا کیوں کہ ان کے یہاں زندگی کی مشکلات سے گھبرا کر فرائڈ سے متاثر جدیدیوں کی طرح فرار کی کوشش نہیں ملتی بلکہ ان سے برسرپیکار ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔

اس وقت ملک جس طرح کی معاشی بدحالی اور سیاسی و ذہنی غلامی میں مبتلا تھا یہ تحریک اس سے نجات حاصل کرنے کا لائحۂ عمل لے کر چلی چنانچہ اس دور کے شعراء اور بالخصوص ان شعراء نے جو اس مکتب فکر سے وابستہ تھے، ادب کو عوام سے قریب تر لانے کی حتی الوسع اور کامیاب کوششیں کیں۔ اس مطمح نظر کا بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ عوام کی بیداری کے بغیر ان مقاصد میں کامیابی مشکل ہے پھر اس تحریک کا مرکز وہ عوام ہی تو تھے جو برسوں پرانی فرسودہ اقدار و روایات

میں نہ صرف الجھے ہوئے تھے بلکہ انہی کو زندگی کی ترقی کا ضامن سمجھ بیٹھے تھے اور "جاگیرداری عہد سے چمٹے ہوئے اہلِ علم، سرمایہ دار اور اجتماعی عوامی شعور کے مخالف [12] دقیانوسی اور رجعت پسند لوگوں کے استحصال کا شکار تھے۔

حالانکہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی قومی و وطنی خیالات شاعری کا اور رومانوی تصورات شعراء کے ذہن و شعور کا حصہ بننے لگے تھے لیکن آزادی اور انقلاب کا جو تصور ترقی پسند شاعروں کے یہاں ابھرا وہ ہر چند کہ اسی قومی تحریکِ آزادی کا حصہ تھا تاہم محض سیاسی آزادی کا محدود تصور نہیں تھا بلکہ معاشی بدحالی اور اقتصادی غلامی سے نجات اور جمہوری اقدار کے استحکام و تحفظ پر مبنی تھا نیز رومان و حقیقت کا امتزاج ان کے یہاں سماجی شعور اور عصری حسیت و آگہی کی دین تھا۔ چنانچہ انقلاب کے نغمات حقیقت کے سروں میں گائے جانے لگے اور عہدِ حاضر کی صعوبتوں اور استحصال پسند قوتوں کے بڑھتے ہوئے جبر و قہر کے خلاف احتجاج و بغاوت کی طرف میلان ہوا۔ فیض الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند تحریک کے نصب العین کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> اس نے ادب کو اجتہاد کے راستے پر ڈال دیا اور زندگی اور ادب کے تعلقات کو واضح کیا ....اب رومانیت تر لضانہ نہ رہی بلکہ اس کے اندر اشتراکی حقیقت نگاری آگئی ۔

۱۲۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سیّد احتشام حسین ص ۲۷۴

اسلوب و شعر میں بھی نئے نئے تجربے کیے جانے لگے
جس سے ایک نئی تکنیک کی بنیاد پڑی۔ [۱۳]

اس طرح جدید طرزِ فکر و طرزِ احساس اور نئے تصورِ فن کا باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ہوا۔ ملکی اور سیاسی غلامی، سماجی و سیاسی اور اقتصادی اقدار کی مجہولیت، متوسط اور محنت کش طبقوں کی ذہنی بیچیدگیوں اور معاشی بدحالی، فرسودہ تہذیبی روایات و معاشرتی اقدار، سامراجیت کے استحصال پسند رویے، استعماری قوتوں، نئی سرمایہ داریت اور جاگیرداریت کے جبر و استبداد کے خلاف اور معاشی و معاشرتی حالات کی بہتری، اشتراکی اصولوں پر مبنی غیر طبقہ واری نظامِ حکومت کے قیام کے جذبے کو ابھارنے پر غور و فکر کیا گیا۔ چنانچہ پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

ادب محض دل بہلاوے کی چیز نہیں ہے.....
جس سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی و ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے.....اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوتا.....ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ [۱۴]

[۱۳] ادب میں روایت اور بغاوت کا مفہوم بحوالہ اردو ادب علی گڑھ ص ۲۶۴
[۱۴] ادب کی غرض و غایت بحوالہ گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر ص ۲۰ تا ۲۷

یہ اقتباس پریم چند کے اس صدارتی خطبہ سے ماخوذ ہے جو انھوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں دیا تھا۔ اس تحریک کو چونکہ ہندوستان کی اکابر سیاسی و غیر سیاسی، سماجی و ادبی اور مذہبی ہستیوں کی سرپرستی اور حمایت یا ہمدردی حاصل تھی اس لیے ملک گیر سطح پر اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی تقریریں اور رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام اس کا کھلا ثبوت ہے۔ چنانچہ وہ شعراء بھی جو نظریاتی سطح پر اس تنظیم میں شامل نہیں تھے" انھوں نے بھی اپنے فکر و شعر میں ان سیاسی اور سماجی مسائل کو پیش کرنا شروع کیا جن کی نشاندہی ترقی پسند تحریک کے منشور میں کی گئی تھی۔ [۱۵]

ترقی پسند شعراء نے انقلاب کے رومانوی اور مجرد تصورات (جوش ملیح آبادی اور مجاز لکھنوی) غلامی سے نجات کی خواہش، سامراجی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصال کے خلاف احتجاج و بغاوت (فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، نیاز حیدر، مخدوم محی الدین، مجروح سلطانپوری معین احسن جذبی، احمد ندیم قاسمی، وامق جونپوری، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی) اور ٹھوس اشتراکی انقلاب کے تصور و خیال اور جذبہ و فکر کو شاعری کا موضوع قرار دیا اور انسان دوستی، قومی یک جہتی اور عالمی امن کا پیغام بھی دیا۔" اس طرح نظم نگاری کو نئے پر پرواز ملے۔ نظم نگاری کی یہ تحریک زندگی اور فن کے ان اقدار کی تلاش تھی جو انفرادی اور اجتماعی توازن اور آسودگی کے ضامن ہوں۔ [۱۶]

۱۵ اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۱۷۴

۱۶ جدید ادب، منظر اور پس منظر: پروفیسر احتشام حسین ص ۲۵۲

ترقی پسند شعراء نے موضوع، خیال، فکر اور اسلوب میں تنوع پیدا کیا اور تجربات و مشاہدات میں احساس کی شدت اور جذبے کے خلوص کو اولیت دی اور ہیئت کے مقابلے میں معنی یا مواد کو مقدم سمجھا۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

> ...... معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلے میں ہیئت فروعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخئیل صاف ستھرا اور بلند ہے تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے۔ ؎۱۷

باایں ہمہ گیت، سانیٹ، آزاد، معریٰ اور نثری نظمیں اس دور میں مروج ہوئیں اور ان تکنیک کو خیالات و افکار کا ذریعہ بھی بنایا گیا ساتھ ہی ساتھ اس عہد میں "پامال لفظی تراکیب، بندشیں استعارے اور تشبیہیں از خود متروک ہوگئیں اور ان کی جگہ لفظ کو ایک نئے تخلیقی رنگ میں استعمال کرنے کا رویہ پیدا ہوگیا۔ ؎۱۸
ترقی پسند شعراء کے ہاتھوں اردو غزل، نظم اور قطعات وغیرہ ایسی اصناف کے استعاروں، علامتوں اور تشبیہوں کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کی قیامت خیزی اور آزادی کے بعد ہونے والی خوں ریزی نے حالات و ماحول اور زندگی کے تئیں شکوک و شبہات اور بے یقینی کے نہ جانے کتنے در وا کر دیے۔ اثرات اور رد و قبول سے متعلق قدرے تفصیلی

؎۱۷ بحوالہ فن اور شخصیت بمبئی، ساحر لدھیانوی نمبر ص ۱۷۳
؎۱۸ نئے تناظر: وزیر آغا ص ۵۷

بحث میں نے اپنے مضمون بعنوان "اردو ادب پر عالمی اثرات"[19] میں کی ہے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے کی صورت میں ہیجان و اضطراب کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کے زیر اثر ترقی پسند ادباء و شعراء شدید ترین ذہنی اذیت کا شکار ہوئے انجام کار اس تحریک کے حصے بخرے ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو انجمن سے کنارہ کش ہو کر اپنی انفرادی دنیا میں کھو گئے اور کچھ انتہا پسندی کے راستے نکل پڑے اور ادب کو صحافت بنانے پر اصرار کیا۔ فیض احمد فیض کی نظم "یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر" پر علی سردار جعفری کی تنقید اس بات کا اعلان تھی کہ رمزیت اور تغزل سے پُر شاعری ترقی پسند شاعری نہیں ہے اور فی زمانہ عوامی انقلاب اور عوامی آزادی کے لیے بیکار ہے چنانچہ چند شاعروں نے علی سردار جعفری کی اس آواز کا استقبال کیا اور

شہر میں بل کھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج ؎

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا ؎

یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے ؎

ایسی شاعری منظرِ عام پر آئی تو ان شعراء کو بہت جلد اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور اس طرح کے خیالات نظم کرنے اور مضمون کے برملا اظہار سے گریز کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں تیسری جنگ عظیم کے خطرات کی طرف

[19] مضمون مطبوعہ گلبن دو ماہی، احمد آباد مئی جون ۱۹۹۰ء

بھی چند شعرا متوجہ ہوئے اور عالمی امن کے قیام اور تحفظ کا خیال عام ہوا ساتھ ہی خوبصورت طویل نظموں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔
ترقی پسند شاعروں نے اس ہیئتی سانچے کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ علی سردار جعفری کی نظم نئی دنیا کو سلام، کیفی اعظمی کی ابن مریم جاں نثار اختر کی آخری لمحہ، اختر الایمان کی ایک لڑکا اور ساحر لدھیانوی کی اے شریف انسانو! اور طویل ترین شاہ کار ڈرامائی نظم پرچھائیاں اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں۔

یہاں ترقی پسند تحریک کا قدرے تفصیلی جائزہ اس لیے لیا گیا ہے کیوں کہ ساحر نظریاتی طور پر اس تحریک سے وابستہ تھے۔ بہرحال مختصر یہ کہ ترقی پسند شاعروں نے ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی، بے بنیاد روحانیت، تصور پرستی اور تخئیلیت سے گریز اور عقلیت پسندی کے فروغ، عوامی دکھ سکھ اور ان کے بنیادی مسائل کی عکاسی کو اپنا نصب العین بنایا اور ادب کو مقصدیت اور افادیت سے جوڑ دیا۔